قرآن حکیم اور عروج و زوالِ اُمم

جناب میر حسین صاحب ایم ۔ اے ۔ فاضل دیوبند

(۲)

کسی قوم میں روحِ عمل پھونکنے، اس کے خون کو گرمانے اور اس کے رگ و پے میں بجلیاں بھرنے والا تیسرا بڑا عامل اس قوم کا نصب العین اور مقصدِ حیات ہے۔ یہ نصب العین حصولِ مسرت و آسائش بھی ہو سکتا ہے۔ اور اقتدار و استعلاء کا جذبہ بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں ہر مقصد انسان کو آمادۂ عمل بناتا ہے اور ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ وسائل دوسروں سے چھین کر اپنے قبضے میں لے آنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن جو سیمابی کیفیت کسی قوم میں اس کا نظریاتی مقصدِ حیات پیدا کرتا ہے وہ کسی دوسرے جذبے سے ممکن نہیں۔ یہ نظریاتی مقصد اسے ایسا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے جسے کسی کل چین نہیں پڑتا۔ اس کی تبلیغ و ترویج کے لیے وہ قوم جدوجہد کرتی، کڑیاں جھیلتی اور راہ کی تمام صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہے — نصب العین کی یہ آتشِ سوزاں اس میں وہ وسعتِ نگاہ پیدا کر دیتی ہے کہ اس کی نظریں اُفق پار پہ جا ٹھہرتی ہیں اور اسے وہ عزم اور حوصلہ بخشتی ہے کہ نہ صحراؤں کی وسعتیں اس کی پیش قدمی روک سکتی ہیں اور نہ کوہساروں کی رفعتیں۔ وہ آفاق پر نگاہیں جمائے سمندروں میں گھوڑے ڈال دیتی ہے اور کشتیوں کو جلا ڈالتی ہے کہ پسپائی کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ جدوجہد کی اسی زندگی کا خوگر رکھنے کے لیے حضرت عمرؓ نے اپنے امرا اور سپاہ پر کھُردرے رہن سہن کی پابندی لگا رکھی تھی اور تنعم و تعیش سے منع فرمایا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے: اَلْجِهَادُ

مَاضٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ کہ جدوجہد کی ضرورت قیامت تک باقی رہے گی۔

لیکن اقتدار پالینے کے بعد وسائل معیشت پر تسلط ہو جانے کے بعد اس بات کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے کہ قوم تعیشات و تنعمات کی عادی بن کر اپنے مقصدِ حیات کو بتدریج پس پشت ڈال دے۔ جدوجہد اور جفاکشی کی زندگی سے دست کش ہو جائے۔ دولت کی محبت اسے بزدل اور موت کا خوف اسے بے غیرت بنا دے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو سمجھ لیجیے کہ نہ صرف اس کے اقتدار و استعلاء کے دن گنے جاچکے بلکہ بہت ممکن ہے کہ بتدریج وہ ذلت و مسکنت کے گڑھے میں جا گرے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کہ ذلت و بے چارگی ان کا مقدر بن گئی۔ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کی ان تینوں کمزوریوں کا متعدد آیات میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ متاعِ دُنیا سے اُن کی محبت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اس کی خاطر وہ کتابِ الٰہی میں تحریف سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ قرآن مجید کہتا ہے: فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (البقرۃ)۔ موت سے ان کے دل اس قدر لرزاں تھے کہ: يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ (البقرۃ) موت کے اسی خوف کی وجہ سے اُنھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ) ان دو باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے اپنے مقصدِ بعثت کو پس پشت ڈال دیا۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ (اٰل عمران)

اقتدار و عروج حاصل ہو جانے کے بعد کوئی قوم کتنی دیر تک اس سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ اس کا انحصار اس نظامِ حکومت اور اس طرزِ معاشرت پر ہے جسے یہ قوم اپناتی ہے۔ یہ حقیقت اتنی واضح اور بدیہی ہے کہ اس پر کسی استدلال کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے جب خدا کی مخلوق کو کسی قوم کے سایۂ عاطفت میں امن و سکون اور عدل و انصاف میسر ہو گا تو جہاں

مخلوق کے خالق کی نصرت و حمایت اسے حاصل ہوگی وہاں خود وہ مخلوق بھی اس سایہ کو اپنے سروں پہ دیر تک قائم رکھنے کی خواہش مند ہوگی اور اس کے لیے کوشاں بھی۔ حمص کے عیسائیوں نے اپنے ہم مذہبوں کے برخلاف مسلمانوں کی فتح و کامرانی کی اسی لیے دعا کی تھی کہ مسلمانوں کے نظامِ عدل و انصاف میں وہ ایک مطمئن زندگی گزار رہے تھے جو انھیں اپنے ہم مذہبوں کے زیر اقتدار میسر نہ آسکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نئی ابھرتی ہوئی امت مسلمہ کو بار بار عدل و انصاف کی تاکید کی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۗءِ ذِي الْقُرْبٰى .... (نحل) دوسرے مقام پر حکم دیا کہ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔ پھر کسی عصبیت میں آکر عدل کا دامن چھوڑ دینے سے بھی روکا گیا بالفاظ دگر دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کے ساتھ معاملہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ قرآن مجید کہتا ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۔ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ: فَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (مائدہ - ۴۲)

عدل کا مفہوم صرف جھگڑوں اور تنازعات کو اصول انصاف کے مطابق طے کرنے تک محدود نہیں بلکہ یہ لفظ اپنے اندر ایک بڑا وسیع اور ہمہ گیر مفہوم رکھتا ہے جو معاشرت، معیشت، محاکمات، سیاست، حکومت اور انسان کے ساتھ انسان کے طرز عمل (اخلاق) کو محیط ہے۔ ان تمام شعبہ ہائے حیات میں عدل و انصاف پر مبنی نظام ہی عدل و انصاف کہلا سکتا ہے اور یہ خوبی صرف اسلامی نظامِ حیات ہی میں پائی جاتی ہے۔ ان دوائر زندگی میں سے کسی ایک میں بے اعتدالی کو ظلم و جور سے تعبیر کیا جائے گا۔

اگر کسی قوم کا معاشرہ عدل کی بنیادوں پر قائم نہیں بلکہ اس میں رنگ، نسل، زبان، مذہب یا ذات پات کی بنیاد پر انسانوں میں اونچ نیچ قائم ہے۔ انسان انسان سے نفرت کرتا ہے۔ اسے اچھوت قرار دیتا ہے، اس کے جان و مال اور عزت و آبرو کو مباح ٹھہراتا ہے۔ اور اسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھتا ہے تو عدالتوں میں نام نہاد انصاف کے باوجود وہ قوم ظالم شمار ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی قوم کے نظامِ معیشت میں بے اعتدا

پائی جاتی ہے۔ چند صنعت کار یا جاگیردار ملک کی معیشت پر قابض ہیں اور قوم کی اکثریت نادار و مفلس اور ان کی دست نگر ہے تو یقیناً یہ قوم بہ حیثیت مجموعی ظلم کی مرتکب ہو رہی ہے اور اگر کسی قوم کا عدالتی نظام بھی ایسا ہو کہ وہاں سے انصاف حاصل کرنے کے لیے پوری زندگی کی بازی لگانی پڑے یا ساری عمر کی کمائی اس میں کھپ جائے تو ظالمانہ نظام کی اس سے بدتر صورت اور کیا ہوگی۔ وہ معاشرہ بھی یقیناً ظلم و عدوان میں مبتلا ہے جس کے نظامِ اخلاق کی بنیاد انسان کے سفلی جذبات کے استحصال پر ہو اور جس کا مقصود و منتہائے فن حصول لذت و مسرت ہو اور جہاں عریانی، بے حیائی، عصمت فروشی، ہم جنسیت، شراب نوشی منشیات کے استعمال جیسی فواحش و منکرات کی کھلی چھٹی ہو۔

ظلم و جور کی یہ ساری صورتیں ایسے عوامل ہیں جو کسی بھی مقتدر قوم کو دیمک کی طرح چاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ سے کہا تھا کہ پہلی قومیں اس لیے تباہ و برباد ہوئیں کہ ان میں عدل و انصاف نہ تھا۔ وہ جرائم کے ارتکاب پر نام نہاد معززین سے تو درگذر کرتے تھے، مگر بے بس و لاچار لوگوں کو تعذیب کے شکنجے میں کس دیا جاتا تھا۔

قرآن مجید کے مطالعے سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قوموں کی ہلاکت و بربادی کا جہاں بھی ذکر کیا ہے، اس کی وجہ اس کا ظلم و عدوان، ان کی مجرمانہ زندگی اور ان کا فسق و فجور ہی بتائی ہے۔ سورۂ الحج میں فرمایا: فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ کہ ہم نے کتنی ہی بستیوں کو اس حالت میں ہلاک کیا کہ وہ ظالم تھیں۔ چنانچہ وہ بستیاں چھتوں کے بل اوندھی گری پڑی ہیں۔ کنوئیں بے کار اور مضبوط محلات برباد ہو چکے ہیں۔

اسی سورت میں دوسرے مقام پر فرمایا: وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ۔ کہ کتنی ہی بستیوں کو ان کے ظالم ہونے کے باوجود میں نے مہلت دی پھر (جب وہ نہ سنبھلے) تو انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔

آخر سبھی کو میری طرف لوٹنا ہے۔ قوم تبع اور ان سے پہلی اقوام کے بارے میں کہا کہ:۔ اَهْلَكْنَاهُمْ ۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ یقیناً وہ مجرم تھے۔

سورۂ کہف میں سنتِ الٰہی بتائی: فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ کہ فسق و فجور اور گناہ کی عادی قوم ہی کو برباد کیا جاتا ہے۔ آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کی بربادی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا: فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ کہ ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کیا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ کسی معاشرے کو ظالمانہ بنیادوں پہ استوار کرتے اور اس میں فواحش و منکرات کو رواج دینے والے ہمیشہ بقول قرآن مترفین یا بالفاظ دگر سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ اپنے سرمائے کے بل پر وہ لوگ ملک کے اندر ایسا نظامِ معیشت قائم کرتے ہیں جس سے زیادہ سے زیادہ وسائلِ دولت انہی کے ہاتھ میں رہیں۔ ملک کی بہت بڑی آبادی کو صرف قوتِ لایموت ہی میسر آسکے۔ ملک کی لاکھوں ایکڑ اراضی کے چند لوگ مالک بن کر مزارعین کا استحصال کرتے ہیں۔ پھر انہی وسائلِ دولت کو کام میں لا کر حکومت و اقتدار پر بھی قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح دولت اور طاقت دونوں انہی کے ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہیں۔ وسائلِ دولت پر قابض ہونے کی وجہ سے وہ عیاشانہ زندگی گزارتے ہیں اور اس کے لیے نئی نئی راہیں نکال کر انہیں معاشرے میں رواج دیتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی درمیانی اور نچلے طبقے کے لوگ بھی ناجائز طریقوں سے دولت کما کر انہی کی راہ پہ گامزن ہو جاتے ہیں اور یوں پورا معاشرہ گناہ آلود زندگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فسق و فجور کے بازار کھل جاتے ہیں۔ مخلوط میل جول کے لیے کلب بن جاتے ہیں۔ آرٹ اور ادب سفلی جذبات کو آگ لگانے کے لیے فتیلے کا کام دینے لگتے ہیں۔ اس گندے کھیل کو جائز اور معقول قرار دینے کے لیے دانشوروں کا ایک طبقہ نئے نئے فلسفے تراش لیتا ہے اور یہ سارا کاروبار انہی مترفین کی تحریک، سرپرستی، حمایت اور خواہش پہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید اس حقیقت کی نشان دہی ان الفاظ میں کرتا ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۔ کہ جب ہم نے کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہا تو اس کے سرمایہ داروں کو اپنے احکام کا مکلّف بنایا جنہوں نے اس بستی میں فسق و فجور کو رواج دیا اور یوں اس بستی کے بارے میں ہمارا فیصلہ صحیح رہا تو ہم نے اُسے بُری طرح سے تباہ و برباد کر دیا ۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورت استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں ۔

(ادارہ)